چمکے اُترے مجھ میں

مرتضیٰ اشعر

چپکے سے اُتر مجھ میں

مرتضیٰ اشعر

مرتضیٰ اشعرؔ کی شاعری

یہ سوال ہے کہ مرتضیٰ اشعرؔ شعر کیوں کہتا ہے؟ میرے لئے بہت اہم ہے۔اس کا یہ شعر اس کی شاعری کا جواز پیش کرتا ہے۔

لفظ بیسا کھیاں بنیں کب تک
لکھ کوئی داستان آنسو سے

لفظ جب اظہار پر قدرت نہیں رکھتے تو شاعری جنم لیتی ہے کہ یہ انسان کی ذات کی خلوت کی پکار ہے۔یہی وجہ ہے کہ مرتضیٰ اشعرؔ کا شاعری میں اپنے کئی معاصرین کی نسبت زیادہ سنجیدہ رویہ ہے۔مرتضیٰ اشعرؔ محبت بھی کرتا ہے اور ماحول پر بھی نظر رکھتا ہے،محبت اسے چیزوں کو دیکھنے کا انداز دیتی ہے اور ماحول اس کے تجربے کو آنچ دیتا ہے،اور یہ دونوں مل کر اسکی شاعری کو جلا دیتے ہیں۔بعض اوقات محبت اور ماحول کا تضاد ملال انگیز کیفیت پیدا کرتا ہے جو اس کی شاعری میں بظاہر نظر نہیں آتی لیکن ذرا غور کرنے سے ملال کا گہرا احساس ہوتا ہے۔وہ شعر میں داستان سمونے کا ہنر جانتا ہے۔اس کا یہ شعر دیکھئے

ڈور سے اُڑتی چڑیا کا پَر کٹ گیا
شام ہونے سے پہلے سفر کٹ گیا

اس شعر میں ایک کہانی مرقوم ہے۔اس پر جتنا بھی غور کیا جائے معانی کی تہیں کھلتی ہیں۔پتنگ اُڑانا خوشی کا شغل ہے۔اور چڑیا کی رزق جُو اُڑان بھی اس کے لئے سامانِ مسرت ہے لیکن دونوں خوشیاں ٹکرا گئیں۔چڑیا کا پَر کٹ گیا۔شام ہونے سے پہلے سفر کٹنے میں ملال کے کئی پہلو ہیں ایسا لگتا ہے کہ چڑیا کے بچے گھونسلے میں چڑیا کے منتظر تھے۔یہ پہلو بھی قابلِ غور ہے کہ شام تک چڑیا نے پرواز سے لطف اندوز ہونا تھا۔مگر وہ پہلے ہی چل بسی۔انسان کی زندگی بھی اس طرح کے حادثات سے بھری پڑی ہے۔مرتضیٰ اشعرؔ کے اکثر اشعار اسی طرح کی تہہ در تہہ معنویت رکھتے ہیں۔

محبت شاعری کا عمومی اور غزل کا خصوصی موضوع ہے۔مرتضیٰ اشعرؔ کی شاعری میں بھی محبت ایک اہم موضوع ہے۔

یوں تری یاد میں سلگتے ہیں
جیسے صحرا میں پیڑ جلتے ہیں

تیری زلفیں ہی مری شامیں ہیں
تیرا۔چہرہ۔ہے۔سویرا۔میرا

خود کو محدود کیا ہے اُس تک
ہے مری ذات پہ بس حق اُس کا

چاند کی الفت میں پاگل ہوگئی
رات کی جاگی ہوئی تھی سوگئی

مرتضیٰ اِک شام اسکی آنکھ سے
ڈوبتے سورج کا منظر دیکھنا

ڈوبتے سورج کا منظر خوبصورت تو لگتا ہے لیکن سورج کے زوال سے وابستہ ہے۔اسے محبوب کی آنکھ سے دیکھنا بڑا بامعنی ہے۔یہ خواہش حیرت پیدا کرتی ہے جو اپنی جگہ بڑی بامعنی ہے۔

مرتضیٰ اشعرؔ کی نظموں کا موضوع محبت ہے۔اس کی مختصر نظمیں برملا اظہار کے ساتھ بلیغ ہیں۔مثلاً

آکسیجن
Oxygen

کہ جس طرح سے
مِری بقا کے لئے
ضروری ہے آکسیجن
اسی طرح
تم بھی ہو ضروری!



عادت

اُسے کہہ دو
نہ آئے میرے خوابوں میں
مری آنکھوں کو تو
خوابوں کی عادت ہے

مرتضٰی اشعؔر زیرک ہے۔وہ اپنے شہر کو دیکھتا ہے تو اس کے حالات پر بھی تبصرہ کرتا ہے۔

ے خرابوں کے اوراق پر گونجتی
ادھوری کہانی ہے اس شہر کی

ے یہاں خواب اگنے کا موسم نہیں
بڑی بانجھ دھرتی ہے اس شہر کی

شاعر خواب دیکھتا ہے اور خواب ہی اس کا سرمایہ ہیں کیونکہ یہ خواب مثالی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے تو وہ دھرتی بانجھ لگتی ہے جہاں خوابوں کی گنجائش نہیں۔مرتضٰی اشعؔر نے جو زندگی گزاری ہے،اس زندگی نے کچھ حقائق بھی اس پر منکشف کیے ہیں اس نے اپنے مشاہدے سے کچھ نتائج بھی اخذ کیے ہیں اور ان کو خوبصورت شعری پیکر میں پیش کیا ہے۔

ے جیت کیسے چومتی ہے پاؤں کو
کشتیاں اپنی جلا کر دیکھنا

ے اِک کنواں کھودنے کی فقط دیر تھی
پیاس رکھی ملی مجھ کو ہر ڈول میں

ے اگر جھوٹ بولیں تو خوفِ فلک
اگر سچ کہیں تو زمیں تنگ ہے

مرتضٰی اشعؔر کو مختصر بحریں مرغوب ہیں۔ہمارے عہد میں رسا چغتائی اور گوہر ہوشیارپورؔی نے مختصر بحروں کو اپنایا۔مختصر بحر میں سہولت اور ابلاغ کے ساتھ شعر کہنا بہت مشکل ہے۔مختصر بحروں میں شاعری بھی ریاضت کی متقاضی ہے۔مرتضی بات جلدی سے،کم الفاظ میں کہنا جانتا ہے۔عام زندگی میں بھی اس کی گفتگو کا یہی انداز ہے اور شاعری میں بھی وہ کم سے کم الفاظ استعمال کرتا ہے۔شاعری ایمائیت اور کفایتِ لفظی کا تقاضا کرتی ہے اور یہی اظہار کی خوبی ہے اور یہ خوبی اس کے یہاں موجود ہے۔

مرتضٰی اشعؔر کو فاعلن ،فعولن،فاعلاتن جیسے ارکان پسند ہیں اور ان ارکان سے ملکر بننے والی بحریں مرغوب ہیں۔وہ مسدس ارکان کو زیادہ پسند کرتا ہے اس کا شعری آہنگ ان ہی ارکان سے ہم آہنگ ہے اور ان ہی ارکان سے پھوٹتا ہے۔یہ ارکان بھی اختصار کا تقاضا کرتے ہیں۔

بات اور بات کہنے کا انداز دونوں اہم ہیں لیکن بعض اوقات بات کہنے کا انداز اس لئے زیادہ اہم ہو جاتا ہے کہ اگر وہ غیر موثر ہو تو بات بے معنی ہو جاتی ہے۔شاعری میں بھی یہی صورت ہے۔مرتضٰی اشعؔر کا پیش کش کا انداز اثر انگیز ہے۔شاعری میں اسلوب بہت اہمیت رکھتا ہے۔اس کے اسلوب کے دو نمائندہ شعر دیکھئے۔

ے آج اُس نے بھی خودکشی کر لی
جس کو مرنے سے خوف آتا تھا

ے خونچکاں شہر! تیرے فسادات میں
پھر کسی ماں کا لختِ جگر کٹ گیا

اس کے یہاں اظہار کی جدّت ہے لیکن روایت کے ساتھ مربوط۔اور یہی خوبی قارین کو متاثر کرتی ہے۔مرتضٰی اشعؔر نے شعبدہ بازی نہیں کی۔شاعری کرنے کی کوشش کی ہے اس کے لئے اس نے بڑی محنت اور ریاضت کی ہے اس نے روایت سے رشتہ جوڑ کر اپنے اسلوب کو نیا بنانے کی کوشش کی ہے۔پہلے مجموعوں کی طرح مرتضٰی اشعر کا یہ مجموعہ بھی مقبولیت کے ساتھ ساتھ قاری کو متاثر بھی کرے گا۔

ڈاکٹر محمد امین

مزامیر

غزلیں

نظمیں

مرتضیٰ اشعر

نعت

تخلیق کا وجود جہاں تک نظر میں ہے
جو کچھ بھی ہے وہ حلقۂ خیرالبشر میں ہے

روشن ہے کائنات فقط اُس کی ذات سے
وہ نور ہے اُسی کا جو شمس و قمر میں ہے

اُس نے سکھائے ہیں ہمیں آدابِ بندگی
تہذیب آشنائی یہ اُس کے ثمر میں ہے

چھُو کر میں آؤں گنبدِ خضرا کے بام و در
یہ ایک خواب ہے جو مری چشمِ تر میں ہے

دربارِ مصطفیٰ ﷺ سے مجھے اذن تو ملے
پرواز کی رسائی مرے بال و پَر میں ہے

جب سے مدینے جانے کی دل میں کسک ہوئی
تب سے یہ میری سوچ مسلسل سفر میں ہے

بن جائے گی وسیلہ یہ میری نجات کا
شامل جو نعت آپؐ کی میرے ہنر میں ہے

فن کو شعورِ نعت ملا جب سے مرتضیٰؔ
اِک روشنی سی زندگی کی رہگزر میں ہے



غزل

ڈور سے اُڑتی چڑیا کا پَر کٹ گیا
شام ہونے سے پہلے سفر کٹ گیا

پیاس دھرتی کی بجھنے سے کچھ پیشتر
دھوپ کے وار سے ابرِ تر کٹ گیا

رسمِ شبیرؓ پھر سے ادا ہو گئی
سچ کی پاداش میں ایک سر کٹ گیا

خونچکاں شہر تیرے فسادات میں
پھر کسی ماں کا لختِ جگر کٹ گیا

چھڑ گئی بحث سی نیند اور آنکھ میں
شب کا پچھلا پہر جاگ کر کٹ گیا

یہ کہا پیڑ نے پیڑ سے مرتضیٰ
جو ہوا بے ثمر وہ شجر کٹ گیا



غزل

انا پرست تو ہم ہیں ، غرور کس کا ہے
مبارزت کے عمل میں قصور کس کا ہے

تمھاری آنکھ میں تو آفتاب کھلتے ہیں
مگر ہمارے چراغوں میں نور کس کا ہے

یہ کون مجھ میں مجھے ڈھونڈتا ہے ہر لحظہ
مرے وجود پہ قائم شعور کس کا ہے

مجھے بتاؤ کہ چارہ گری کروں کس کی
مری تھکن سے بدن چُور چُور کس کا ہے

کسی کو بھی نہیں معلوم راز ہستی کا
کتابِ زیست پہ اشعرؔ عبور کس کا ہے



غزل

یوں تری یاد میں سلگتے ہیں
جیسے صحرا میں پیڑ جلتے ہیں

لے اُڑے گی ہوائے دہر ہمیں
ہم خزاں رُت کے زرد پتے ہیں

خشک دریا اُنہیں نہیں دُکھتے
جو پرندے اُڑان رکھتے ہیں

جوڑتے ہیں تمام دن خود کو
رات بھر ریزہ ریزہ ہوتے ہیں

رتجگے کاٹتے ہیں راتوں کو
ہم کہ دن بھر جو نیند بوتے ہیں

ہوگئی ہار ، جیت بے معنی
آؤ یہ کھیل ختم کرتے ہیں

اِس لئے بے مراد ہیں شاید
دل میں جو آئے کر گزرتے ہیں

خواب اُس کے قدم قدم اشعرؔ
آنکھ کے راستے میں آتے ہیں

☆

غزل

نہ میں موم ہوں اور نہ وہ سنگ ہے
فقط یہ اناؤں کی اِک جنگ ہے

اگر جھوٹ بولیں تو خوفِ فلک
اگر سچ کہیں تو زمیں تنگ ہے

محبت ہے اِک عہد کا نام اور
ہوس لہر ہے ، زہر ہے ، ڈنگ ہے

ترا حسن اِک عارضی رُوپ ہے
مرا عشق اِک دائمی رنگ ہے

تری سوچ کے مختلف ہیں خطوط
مرے سوچنے کا الگ ڈھنگ ہے

جو سوچا نہیں تھا وہی ہو گیا
میں حیران ہوں اور تو دنگ ہے

اگر دَو (۲) دِلوں میں نہ ہو فاصلہ
تو دِلّی بھی پھر ایک فرسنگ ہے

اُسے سوچ کر دیکھنا مرتضیٰ
کہ وہ شخص تجھ سے ہم آہنگ ہے

☆

مرتضیٰ اشعر

غزل

اسطرح قید ہوں ذات کے خول میں
گولیاں ہوتی ہیں جیسے پستول میں

اِک کنواں کھودنے کی فقط دیر تھی
پیاس رکھی ملی مجھ کو ہر ڈول میں

منتظر ہیں کسی آخری ہچکی کے
ہم اناؤں کے زندانِ پُر ہول میں

کہہ رہی ہیں مناظر کی خاموشیاں
کس قدر تابکاری ہے ماحول میں

ہو گیا شل بدن اپنے ہی بوجھ سے
کاٹ ایسی تھی اُس لہجے میں ، بول میں

رات بھر دندناتے پھرے مرتضیٰ
یاد کے بھیڑیے سوچ کے غول میں



غزل

تھا فقط منظرِ صدا پتّا
سو ہوا شاخ سے رِہا پتّا

موت ہے ہاتھ اِک جواری کا
زندگی جیسے تاش کا پتّا

شاخچوں سے ہوا کا جھگڑا تھا
اور ندّی میں جا گِرا پتّا

چاندنی میں چراغ لگنے لگا
آب پر زرد تیرتا پتّا

جم کے پتھر پہ ہوگیا پتھر
ایک تصویر کھینچتا پتّا

تیری چاہت کی سبز ڈالی سے
جھڑ گیا میرے نام کا پتّا

پھول چن کر کتاب سے میری
رکھ دیا اُس نے ملگجا پتّا

مرتضیٰ سوچ کر بتاؤ تم
کون بہتر ہے پھول یا پتّا



غزل

آہنی دیوار میں در دیکھنا
ایک دن خود سے نکل کر دیکھنا

جیت کیسے چومتی ہے پاؤں کو
کشتیاں اپنی جلا کر دیکھنا

کون پھولوں سے سواگت کرتا ہے
کس کے ہاتھوں میں ہے پتھر دیکھنا

یاد کے سونے دریچوں سے کوئی
جھانکتا ہے میرے اندر دیکھنا

جان لینا فاختہ مجبور ہے
جب کوئی سہما کبوتر دیکھنا

مرتضیٰ اِک شام اُس کی آنکھ سے
ڈوبتے سورج کا منظر دیکھنا



غزل

زخم کتنے لگے ہیں چاقو سے
کون پوچھے یہ بات آہو سے

شہر میں یاد آتا ہے گاؤں
اور وہ لوگ دست و بازو سے

دوستی ہے خلوص کا رشتہ
تو لئے مت اِسے ترازو سے

جو جہاں میں مثال بنتے ہیں
اب کہاں ہیں وہ لوگ باہو سے

لفظ بیساکھیاں بنیں کب تک
لِکھ کوئی داستان آنسو سے

غزل

نفرتوں کا وسیع دریا ہو
ہاتھ شل ہو چکے ہیں چپّو سے

ایک دم ہو گیا ہوں پتھر کا
آپ کی گفتگو کے جادو سے

دن نکلتا ہے دیکھ کر چہرہ
شب بندھی ہے تمھارے گیسو سے

پھر مجھے کاٹنے لگا بستر
اُٹھ گیا تھا کوئی جو پہلو سے

اُس نے ٹانکا تھا پھول کالر میں
میں مُعطّر ہوں اُس کی خوشبو سے

مرتضیٰ یہ سکوت اچھا ہے
جان جاتی ہے میری ہا ہو سے



غزل

ہوا چیر دیتی ہے اِس شہر کی
فضا موت جیسی ہے اِس شہر کی

لہو کے سمندر سے شمشان تک
ملاقات ہوتی ہے اِس شہر کی

خرابوں کے اوراق پر گونجتی
ادھوری کہانی ہے اِس شہر کی

یہاں خواب اُگنے کا موسم نہیں
بڑی بانجھ دھرتی ہے اِس شہر کی

سُنا ہے ابھی تک یہاں اِک گلی
مری منتظر تھی ، ہے اِس شہر کی

اُسے خط لِکھو اب کے تو پوچھنا
کبھی یاد آئی ہے اِس شہر کی

علاقہ ہے اِس سے مجھے مرتضیٰ
ہر اِک چیز پیاری ہے اِس شہر کی



غزل

چلو شاید کہ منزل کا نشاں ہے
نہیں تو یہ مسافت رایئگاں ہے

نہ ہی تم میں سکت طوفاں سے لڑ لو
نہ اپنے پاس کوئی بادباں ہے

فقط ہم نام دینے سے ہیں قاصر
تعلق تو ہمارے درمیاں ہے

میں باسی ہوں کسی بنجر زمیں کا
مقابل میرے پیاسا آسماں ہے

نہیں ہوتی اسیرِ وقت اشعرؔ
محبت دائمی ہے ، جاوداں ہے



غزل

مفلوج کئے پہلے مرے ہاتھ مکمل
پھر چھین لیا مجھ سے مرا ساتھ مکمل

اُس پر کسی پنچھی کا ٹھکانہ نہیں ہوتا
جس پیڑ کے جھڑ جاتے ہیں پھل پات مکمل

جب جیت گیا اُس سے تو پھر جا کے کھلا یہ
میں جیت جسے سمجھا وہ تھی مات مکمل

دو گام کی سنگت ہمیں منظور نہیں ہے
دینا ہے اگر تم کو تو دو ساتھ مکمل

خواہش کسے ہوتی نہیں اُس باغِ ارم کی
قسمت ہی سے ہوتی ہیں مُناجات مکمل



غزل

جو عبث ہم پہ رہا شک اُس کا
ہے نہیں ہم کو گِلہ تک اُس کا

خود کو محدود کیا ہے اُس تک
ہے مری ذات پہ بس حق اُس کا

روز آتا تھا وہ تجھ سے ملنے
یوں تو تھا دور بہت چک اُس کا

وہ ترے پیار کا دم بھرتا ہے
تو بھی کچھ مان کبھی رکھ اُس کا

وہ جسے تم سے محبت تھی ، ہے
ہو تمہیں ساتھ مبارک اُس کا

اتنے بھی پاس نہ جاؤ اُس کے
دل کرے گا نہیں دھک اُس کا؟

مرتضیٰ کھیل رہے تھے "لڈّو"
آگیا فون اچانک اُس کا



غزل

میرا دامن تو صاف تھا لیکن
شہر سارا خلاف تھا لیکن

اِک پری کی مجھے بھی چاہ رہی
درمیاں کوہ قاف تھا لیکن

پیار تھا اُس کی ذات سے گہرا
سوچ سے اختلاف تھا لیکن

یہ الگ ہے گِلے رہے اُس سے
زندگی کا طواف تھا لیکن

آنکھ کی جھالروں پہ شبنم تھی
قہقہہ واشگاف تھا لیکن

دھوپ لمحوں میں سائباں میرا
برف رُت میں لحاف تھا لیکن

مجھ پہ تعزیر لگ گئی اشعؔر
جرم اُس کا معاف تھا لیکن

☆

غزل

خسارہ بھی اگر ہو منفعت کہنا
محبت کو کبھی آزار مت کہنا

کبھی آہٹ کو دستک جاننا دل کا
کبھی یوں ہی کسی پُرزے کو خط کہنا

تم اپنے سر کوئی الزام مت لینا
جُدائی پر تھے میرے دستخط کہنا

خطائیں ٹھیک ہیں اپنی جگہ لیکن
محبت میں غلط ہے معذرت کہنا

سنو! پہلے مجھے تسخیر کر لو تم
پھر اُس کے بعد اپنی سلطنت کہنا

ہمیشہ سچ کو سچ گردانتا اشعؔر
جہاں دیکھو غلط ہوتا ، غلط کہنا

غزل

تری یاد کا نقش گہرا نہیں ہے
مگر سوچ پر کوئی پہرہ نہیں ہے

نہیں ہے ترا حسن کوئی عدالت
مرا عشق کوئی کٹہرا نہیں ہے

رعایا بھی کچھ بے زباں ہے یہاں کی
فقط ایک حاکم ہی بہرہ نہیں ہے

مرے پاس آ تجھ کو سیراب کر دوں
مری ذات دریا ہے صحرا نہیں ہے

ابھی آنکھ کی گرد نکلی نہیں ہے
ابھی دل کا وہ درد ٹھہرا نہیں ہے

مرے ساتھ چل تو رہے ہو سفر میں
مرا ''آج'' کل سا سُنہرا نہیں ہے

مری ہار کے جشن کا غدر ہے یہ
کوئی عید ، ہولی ، دسہرا نہیں ہے



غزل

غدر سے بے خبر نہیں ہونا
بدعائے بشر نہیں ہونا

منزلوں کا سُراغ بھی رکھنا
صرف گردِ سفر نہیں ہونا

تان رکھنا وجود پر چھایا
ماسوائے شجر نہیں ہونا

شام بننا کوئی سُہانی سی
جون کی دوپہر نہیں ہونا

صحرا کی خشکیوں سے ٹکرا کر
پانیوں کا بھنور نہیں ہونا

مرتضیٰ لوگ روند ڈالیں گے
اتنے بھی بے ضرر نہیں ہونا



غزل

مِری آنکھ برکھا کا بے مہر پانی
تِری لہر بجلی ، مِری لہر پانی

کہ چھلکے ہیں دریا کے جب بھی کنارے
بہا لے گیا بستیاں ، شہر پانی

اُتر آئے آنکھوں میں برسات موسم
نظر آیا پھر دہر کا دہر پانی

(ق)

اُبھر آتا ہے ڈوبتا دوست چہرہ
میں جب دیکھتا ہوں کبھی نہر ، پانی

کسی کے لئے ہوگا تریاق اشعرؔ
مِرے واسطے بن گیا زہر پانی



غزل

بجھ گیا دیپ بھی جلتا جلتا
اِس قدر خوف تھا لمحہ لمحہ

میں تِرے شہر سے یوں لوٹ آیا
درد بکھرے ملے چہرہ چہرہ

دور ہوتی گئی منزل مجھ سے
اور میں تھک گیا چلتا چلتا

میں اگر سائے طلب کرنے لگوں
دھوپ بجھ جائے گی رستہ رستہ

وقت کی دُھول سے یادوں کے سبھی
نقش مٹ جائیں گے رفتہ رفتہ

خود پہ تھا زعم جسے حد درجے
ہوگیا ٹوٹ کے ریزہ ریزہ

اُس کی چاہت بھی میں پہلی پہلی
پیار میرا بھی وہ پہلا پہلا

پھول کھلنے لگے میرے اطراف
ہنس پڑا تھا کوئی روتا روتا



غزل

تیغ اپنوں نے چھینی تھی
ورنہ جیت یقینی تھی

رات سحر تک مہکا ہوں
اُس کی خوشبو بھینی تھی

ہم فرسودہ کہلائے
اپنی خصلت دینی تھی

نازک ہاتھ جلا ڈالے
چائے لازم پینی تھی

پریوں سے سُندر تھا رُوپ
لیکن خلق زمینی تھی

کس سُرعت سے درد ملے
وقت کی کوکھ مشینی تھی



غزل

لکیریں تھیں کچھ اور کچھ دائرے
بدلتے رہے آنکھ کے زاویے

جنہیں زعم تھا موم سے جسم پر
انہوں نے کئے سورجوں سے گِلے

امیروں کے لاکرز میں دھن کے ساتھ
غریبوں کے ارمان بھی بند تھے

محبت کی ہے میں نے اُس سے اگر
ضروری نہیں وہ بھی چاہے مجھے

تجھے ساتھ لے کر چلوں کس طرح
مِرے سر پہ موسم ہیں دُکھ دھوپ کے

اُسے ساونوں کی طلب جو ہوئی
سمندر مِری آنکھ میں آگئے



غزل

جس سے رشتہ ہے نہ ناتا میرا
ذات اُس کی ہے اثاثہ میرا

تیری زُلفیں ہی مِری شامیں ہیں
تیرا چہرا ہے سویرا میرا

تُو نیا چاند ، میں ڈھلتا سورج
ساتھ نبھنا نہیں تیرا میرا

میں ترا قرض چکاؤں کیسے؟
مجھ پہ تو قرض ہے اپنا میرا

پیار کی میرے اُسے عادت ہے
اُس نے غصّہ نہیں دیکھا میرا

وہ تو خوشبو ہے بھلا دے اُس کو
مرتضٰی مان بھی کہنا میرا



غزل

موت کا سر پہ تاج لینا ہے
زندگی سے خراج لینا ہے

وہ سخی ہے نواز دے شاید
بے کلی کا علاج لینا ہے

تجھ لئے دل تو کیا ہے جاں حاضر
کر ذرا احتجاج لینا ہے

آنکھ اُکتا گئی اندھیروں سے
روشنی کو رواج لینا ہے

کل کا کیا اعتبار ہے اشعؔر
جو بھی لینا ہے آج لینا ہے



غزل

چاند کی اُلفت میں پاگل ہو گئی
رات کی جاگی ہوئی تھی سو گئی

اسقدر پھیلے جھمیلے آس پاس
ذہن میں اِک یاد تھی سو کھو گئی

اُٹھ گئے سوچوں سے یادوں کے قدم
دھوپ سایوں کے تعاقب کو گئی

''رات آنکھوں'' میں اُداسی کی لکیر
شام گہری ، کتنی گہری ہو گئی

خودنمائی دو (۲) دلوں کے درمیاں
بیج اشعؔر نفرتوں کے بو گئی



غزل

جس کی تصویر ہے اِس دلِ پاک میں
اشک بن کر رہا چشمِ نمناک میں

نظم میں خواب تیرا ، غزل میں خیال
اِک دیا بام پر ، اِک دیا طاق میں

خود کو پرواز سے باز رکھنا پڑا
تھے شکاری مسلسل مِری تاک میں

کس تپش سے جلا آشیانِ وجود
ہوگا کوئی شرارہ بجھی راکھ میں

شعر کے فن میں کیا مرتضٰی کی بساط
کیسے کیسے گہر مل گئے خاک میں



غزل

فضا کا ہول نہ ٹوٹی ہوئی کمان کا ہے
اگر ہے خوف شکاری کو تو مچان کا ہے

میں اُس کو بھولنا تو چاہتا ہوں لیکن پھر
وہ اِک اٹوٹ تعلق جو درمیان کا ہے

تمہارے نام کی ناؤ اُتاری ہے دِل میں
بھروسہ ہم کو ہوا کا نہ بادبان کا ہے

گذر ہے دھوپ کے صحرا سے اب کے اشعؔر اور
ہمارے ساتھ فقط سایہ آسمان کا ہے

☆

غزل

شاخ پر بیٹھا اِک پرندہ تھا
میں جسے اپنا خواب سمجھا تھا

دو گھڑی کو وہ پاس ٹھہرا تھا
کون جانے وہ شخص کیسا تھا

دیکھ آنگن میں تیرے چمکا ہے
میری قسمت کا جو ستارہ تھا

آج اُس نے بھی خودکشی کر لی
جس کو مرنے سے خوف آتا تھا

گھُل گئی ساری تلخی لہجے کی
چائے کا ذائقہ تو میٹھا تھا

(ق)

ہم جُدا راستوں کے رہرو تھے
وقت کچھ ساتھ بھی گذارا تھا

تیری کوئی الگ ہی منزل تھی
میرا کوئی الگ ہی رستہ تھا

بیت جائے گا یہ دسمبر بھی
وہ نہ آیا اُسے نہ آنا تھا

☆

غزل

کیا پتہ اب منتظر آنکھوں میں بینائی نہ ہو
کیا خبر ہم دستکیں دیں اور شنوائی نہ ہو

کیا پتہ بارانِ رحمت کا گذر محلوں سے ہو
کیا خبر کچّے مکانوں پر گھٹا چھائی نہ ہو

کیا پتہ جل جائیں سورج کی تمازت سے بدن
کیا خبر انجام اِس جذبے کا رسوائی نہ ہو

کیا پتہ اپنوں میں کوئی رنگ میرا ناں ملے
کیا خبر وہ اجنبی ہو کر مِرا آئینہ ہو

کیا پتہ تیری طلب سر پھوڑنا ہو سنگ سے
کیا خبر یہ بات ہم نے دِل کو سمجھائی نہ ہو

کیا پتہ چہرے سلگتے ہوں ابھی تک دھوپ میں
کیا خبر شبنم شگوفوں پر اُتر آئی نہ ہو

کیا پتہ لوٹیں تو سوچا ہو بہت کچھ کہنے کا
کیا خبر وہ سامنے آئے تو گویائی نہ ہو

کیا پتہ بجھ جائیں اشعؔر رستہ رستہ دائرے
کیا خبر حاصل سفر کا آبلہ پائی نہ ہو



غزل

پیکار ہے وہ ہم سے کوئی دوسرا نہیں
یہ حادثہ ہمارے لئے اب نیا نہیں

تجھ سے جُدائی کے اُسی اِک فیصلے کے بعد
میں خود بھی اپنے ساتھ کبھی پھر رہا نہیں

جاں اِک اندھیری غار ہے تجھ بن مِرے لئے
دِل ایک ایسا طاق ہے جس میں دِیا نہیں

دیوارِ شب میں یوں تو کئی چھید تھے مگر
کوشش کے باوجود کوئی در بنا نہیں

کچے گھروندے کی طرح میں تیرے ہاتھ میں
کس کس شکست و ریخت سے گذرا پتا نہیں

لازم نہیں کروں تری تعظیم مرتضیٰ
جو دیوتا نہ ہو اُسے میں پوجتا نہیں



غزل

وہ ذرا انتظار کر لیتا
میں خزاں کو بہار کر لیتا

ہم نہ تم کو بھلا سکے ورنہ
ہم سے بھی کوئی پیار کر لیتا

دیپ رکھ کر منڈیر پر دِل کی
زندگی کو مزار کر لیتا

کچھ بھی تو حوصلہ نہ تھا اُس میں
جتنے دریا تھے پار کر لیتا

کاش میں اُس کے ''آج'' سے اشعؔر
اپنا ''کل'' یادگار کر لیتا



غزل

کوئی اپنی جھلک دِکھلا گیا ہے
مِرا اندر تلک مہکا گیا ہے

وہ جو روشن تھا میرے فن کا سورج
جُدائی میں تری گہنا گیا ہے

عقیدت ہو گئی بدنام ناحق
نہ تیرا کچھ ، نہ کچھ میرا گیا ہے

سکونِ قلب ، کاروبار ، شہرت
تمہارے واسطے کیا کیا گیا ہے

اچانک رُک گئی ہے زندگی کیوں؟
مجھے اِک نقطے پر ٹھہرا گیا ہے

خزاں کے موسموں کا زرد پتّا
ہوا کے خوف سے تھرّا گیا ہے

غزل

کسی نے پیڑ ہی کچھ اسطرح اُگائے تھے
وہاں پہ دھوپ دھری ہے جہاں پہ سائے تھے

پھر اُس کے بعد ندی میں اُتر گیا تھا چاند
بس ایک بار ستارے سے جھلملائے تھے

نجانے گھاس کناروں کی کیوں نہیں چمکی
دیئے جلا کے تو ہم نے بہت بہائے تھے

لہولہان ہیں جن سے تمام شہر کے لوگ
کوئی بتائے یہ پتھر کہاں سے آئے تھے

ہوا نے چھین لئے اور اُڑا دیئے اشعؔر
کہ ہم نے آنکھ سے جو نقشِ پا اُٹھائے تھے

غزل

خواب ترے جو دل کی پگڈنڈی سے ہٹ جاتے
شاید پلکوں پر اُمڈے یہ بادل چھٹ جاتے

میں کچّا رستہ وہ پکّی سڑکوں کا عادی
مجھ پر چلتا کیسے پاؤں دھول سے اَٹ جاتے

تم نے سوچا ہی کب اپنی انا سے آگے کچھ
ورنہ بیچ کے فاصلے گھٹتے گھٹتے گھٹ جاتے

صبح سویرے تیرے رستے میں جا بیٹھتے ہم
شام سمے تیرے پیچھے پیچھے پنگھٹ جاتے

آج احساس ہوا ہے اُس کی زندہ ضمیری کا
ورنہ اِک مفلس لڑکی کے کپڑے پھٹ جاتے

وہ ضدی تھا اپنی ضد پر اڑ جاتا اشعؔر
اور ہم سچّے تھے اپنے موقف پر ڈٹ جاتے

غزل

مِری نظر تھا اندھیروں میں ڈھل گیا مجھ سے
وہ میرا آپ تھا اِک دن بدل گیا مجھ سے

وہ میرے جسم میں تھا موجزن لہو کی طرح
اب ایسا لگتا ہے جیسے نکل گیا مجھ سے

میں جانتا تھا ترا پیار مار ڈالے گا
سو اپنے آپ پہ اِک تیر چل گیا مجھ سے

وہ ایک خواب تھا رنگین مچھلیوں جیسا
نگاہ برف ہوئی تو پھسل گیا مجھ سے

مرا جنون تھا یا تیرے پیار کی شدت
ترا کلف لگا کُرتا مسل گیا مجھ سے

نجانے کیسے اُتر آیا ہاتھ میں سورج
وہ تتلیوں کا بدن تھا پگھل گیا مجھ سے

مِرے شعور کی پرواز دیکھ کر اشعؔر
تمہارے شہر کا ہر فرد جل گیا مجھ سے



غزل

اندھیرے میں سیہ شب ہوں کسی شب مجھ میں بس بھی
اگر تو ابر ہے تو ٹوٹ کر مجھ پر برس بھی

تجھے تصویر کرنے کی اجازت چاہتا ہوں
ہے میرے پاس ایزل بھی ، برش بھی ، کینوس بھی

میں تیرے دھیان سے کیسے نکل پاتا کہ جب تھے
ترے پابند میرے دائیں بائیں ، پیش و پس بھی

فقط اس کے ہی بالوں سے گلاب اُترے نہیں ہیں
ہوئی عاری گلوں سے میرے دل کی کارنس بھی

سلگتی ریت پر رَم کا بڑا تھا شوق مجھ کو
ذرا اے ریگِ صحرا ! اب مِرے پاؤں جھلس بھی

ہوائے شہر کے تیور بدلتے جا رہے ہیں
محبت کے لبادوں میں جنم لے گی ہوس بھی

سفر کی چاہ ہے تو نوچ مت اپنے پروں کو
نہ دیں گے ساتھ تیرا بے پری میں ہم قفس بھی

سپیرے نے پٹاری کھول دی یہ کہہ کے اشعرؔ
مجھے نیلا فلک ہونا ہے کالے ناگ ڈس بھی

☆

غزل

تتلی سی کوئی پنکھ کی چادر سے اُڑی ہے
یہ نیند مِری خواب کی ٹھوکر سے اُڑی ہے

شاید کسی بھوکے کو سُلا دے گی سکوں سے
گھنٹی کوئی پیتل کی جو مندر سے اُڑی ہے

آسیب زدہ ہوگا کہ اژدر کا ٹھکانہ
اُس پیڑ سے وہ چیل کسی ڈر سے اُڑی ہے

کیا ''سنگِ نظر'' آ گیا تھا شیشہ گروں میں؟
وہ کانچ کا پیکر کسی پتھر سے اُڑی ہے

بوسیدہ مکاں سا میں ، زمیں بوس ہوا ہوں
یہ خاک مِرے اپنے ہی اندر سے اُڑی ہے

زینت بنی ہے مرتضیٰ جو اُس کی جبیں کی
سلوٹ کہ شکن ہو مِرے بستر سے اُڑی ہے

غزل

کچھ اِس خیال سے شہ کے قریں نہیں جاتے
ہم ایسے لوگ جھکا کر جبیں نہیں جاتے

ستارے آب دکھاتے نہیں ہیں سورج کو
کہ آئنے کے مقابل حسیں نہیں جاتے

تمام شہر میں یوں تو بھٹکتے ہیں رستے
مگر جہاں پہ ہو جانا وہیں نہیں جاتے

تمھاری سوچ کے پنچھی نجوم کی صورت
فلک نشین ہیں سوئے زمیں نہیں جاتے

تمھارا مشغلہ تھا خواب سازیاں لیکن
ہماری آنکھ سے لعل و نگیں نہیں جاتے

کچھ ایسا خوف ہے اب کے فضاؤں میں اشعؔر
کہ گھونسلوں سے پرندے کہیں نہیں جاتے

☆

غزل

گوریاں ہوتی ہیں جیسے ساجنوں کی قید میں
میری آنکھیں ہیں مسلسل ساونوں کی قید میں

کس طرح پھر درمیاں کے فاصلوں کو دوش دیں
جب رہے ہم ہی انا کے معبدوں کی قید میں

منتظر ہیں کتنی ہی افلاس ماری لڑکیاں
شاہزادوں کی، گھروں کی چوکھٹوں کی قید میں

اِک پری کا خواب توڑا تھا اُسی پاداش میں
مرتضٰی میں آج تک ہوں رتجگوں کی قید میں

☆

غزل

ہوتا ہے بازگشت میں جیسے صدا کے ساتھ
میرے قدم قدم پہ سزا تھی سزا کے ساتھ

اِک طاق پر چراغ جلانے کی چاہ میں
کرنی پڑی ہے دوستی ہم کو ہوا کے ساتھ

سوتا ہوں روز رات کو آغوشِ آہ میں
ہر صبح جاگتا ہوں کسی بدعا کے ساتھ

کیسے کرو گے اُس کی وفا کا یقین تم
کوئی جو چل پڑا ہے کسی کو بھلا کے ساتھ

شکوہ نہیں ہے مرتضٰی تقدیر سے ہمیں
مانگا تھا اُس سے اُسکو، اُسی کی رضا کے ساتھ

☆

غزل

تھکن سے جب بدن ٹوٹے گا تو آرام کرلیں گے
ابھی دن ہے جہاں سورج ڈھلے گا شام کرلیں گے

ہمیں اپنے ارادوں کی ثباتی پر بھروسہ ہے
ہم اپنی منزلوں کے راستوں کو رام کرلیں گے

چراغِ زیست کی افسانویت کے جو قائل ہیں
وہی اندھے خنک جھونکوں کو اپنے نام کرلیں گے

کبھی ہم میں طلب جاگی اگر بادہ گساری کی
لہو کو مے سمجھ لیں گے، بدن کو جام کرلیں گے

کسی دن لوٹ آئیں گے اچانک شہرتوں سے ہم
تِری خواہش پہ اپنے آپ کو گمنام کرلیں گے

ابھی تو برسرِ پیکار رہنا ہے ہمیں خود سے
کبھی مہلت ملے گی تو ادھورے کام کرلیں گے

کسی تذلیل سے پہلے جدا ہو جائیں گے اشعرؔ
اُسے آغاز سونپا تھا تو ہم انجام کرلیں گے

☆

غزل

نہ سکون دے نہ قرار دے ، مجھے امتحاں سے گذار دے
اُسے جیت دے اُسے پیار دے، مجھے مات دے مجھے ہار دے

مِری آنکھ میں تِرا خواب ہے، اُسے نوچ لے ذرا سوچ لے
کوئی پھانس دل میں اُتار دے ، مِرا زخم زخم نکھار دے

کسی شام کو مرے نام کر ، کوئی بات ہو تِرا ساتھ ہو
مِری ایک شب تو سنوار دے ، مجھے پیار کر مجھے پیار دے

کبھی آس پاس سنو تجھے ، کبھی حرف حرف بنوں تجھے
مِرے راستوں کو غبار دے ، کوئی قربتوں کا حصار دے

☆

urdukutabkhanapk.blogspot.com

غزل

تِرا مفاد بھی ہم کو دکھائی دیتا ہے
وگرنہ کون کسی کو بھلائی دیتا ہے

کبھی غریب کو عزت گنوانی پڑتی ہے
کبھی لگان میں پوری کمائی دیتا ہے

مِری ہی سوچ کی چاندی ہے میرے بالوں میں
قلم کو میرا لہو روشنائی دیتا ہے

کبھی جھمیلے سے باہر نکل سکے تو سُن
وہ غدر جو مِرے اندر سنائی دیتا ہے

مِرا ہی ذہن تجھے ڈھالتا ہے شعروں میں
مِرا خیال تجھے دلربائی دیتا ہے

اِسی لئے کسی کو چاہتا نہیں ہوں میں
کہ آخرش یہی جذبہ جدائی دیتا ہے

اب ایک عرصہ ہوا زیست کو اسیری میں
وہ دیکھئے ہمیں کب تک رہائی دیتا ہے

نہیں ملے گا تمہیں غیر میں کبھی اشعرؔ
وہ اعتبار کہ جو ایک بھائی دیتا ہے

☆

غزل

یوں تو صبح بھی سُندر ہے پیاری ہے
پر اپنی عادت شب بیداری ہے

سہما سہما سا ہے ہر اِک منظر
چہرہ چہرہ اِک خوف سا طاری ہے

سوچو تو کوئی مخلص دوست نہیں
جو دیکھو تو ڈھیروں سے یاری ہے

کھوج ہو جس میں اَن دیکھی منزل کا
ایسے ایک سفر کی تیاری ہے

اُس کے ترکش میں تیر نہیں شاید
گھائل شخص اُٹھ اب تیری باری ہے

''آمر'' کہتا ہے جو مجھ کو اشعرؔ
اُس کا اپنا ذہن بھی تاتاری ہے



(نظمیں)

تمھارے لئے ایک نظم

ہم اپنے خواب لکھنے سے ذرا پہلے
تمہاری یاد سے ہو کر گذرتے ہیں
تو پھر
جو کچھ قلم قرطاس پر تصویر کرتا ہے
تمہارا عکس ہوتا ہے



نئے سال کی پہلی دُعا

ایک اس کے سوا
میں نئے سال سے
اور تو کچھ نہیں
کچھ نہیں مانگتا



کمٹڈ سیپریشن کے بعد

کل کو میرے بچوں پر یہ
واضح ہوگی ساری صورت
سوچیں گے وہ ملتی ہے کیوں؟
اُن کے ساتھ تمہاری صورت



محور

کہ جیسے
زمیں گھومتی رہتی ہے
گرد محور کے اپنے
مِری ذات بھی
ایسے ہی گھومتی ہے
ترے گرد!



آکسیجن
Oxygen

کہ جس طرح سے
مِری بقا کے لئے
ضروری ہے آکسیجن
اسی طرح
تم بھی ہو ضروری!



عادت

اُسے کہہ دو
نہ آئے میرے خوابوں میں
مری آنکھوں کو تو
خوابوں کی عادت ہے



دُعا

سوچ پگڈنڈیوں پر رواں راگنی
بے سکونی کے عالم میں اکثر،
نمازوں کے بعد
اِک تجھے بھولنے کی
دعا مانگتا ہوں۔



حافظہ

عجب ہے حافظہ میرا
کہ جو میں یاد رکھنا چاہتا ہوں،
بھول جاتا ہوں
جسے میں بھولنا چاہوں
وہی سب یاد رہتا ہے۔



گہری نیند

(سیلاب کے موقع پر لکھی گئی ایک نظم)

مانجھیوں کا تھا رزق جو پانی
اب انہیں کو ڈبو رہا ہے کیوں؟
جاگ اُٹھا چناب پھر شاید
موت ہے لہر لہر پانی کی
پیاس سب کی بُجھانے والا یم
بھوک اپنی مٹا رہا ہے اب
ہر کوئی سر جھکا رہا ہے اب
بستیاں سو گئی ہیں۔۔۔
گہری نیند



چُپکے سے اُتر مجھ میں

چاہت کا سبق
پڑھ لے
چپکے سے اُتر مجھ میں
اِس دل کا ورق پڑھ لے۔



خواب

وہ لڑکی
مِرا خواب ہے
خواب۔۔۔۔
جس کا حقیقت سے
کوئی تعلق نہیں۔



انتظار

تو اپنی ذات میں گُم ہے
میں خود سے بے خبر ہوں
ایک تنہا سا شجر ہوں
بہتی ندّی کے کنارے
چلچلاتی دھوپ میں
کب سے کھڑا ہوں
اپنی ہی ضد پر اڑا ہوں
تو کبھی آئے سہی
اک بار میرے پاس
تیرے دل میں ہو احساس
تو سائے بچھا دوں گا
سواگت میں ترے
اپنی تھکن ساری بھلا دوں گا
تجھے ٹھنڈی ہوا دوں گا
میں کب سے منتظر ہوں!



''ن''(نون)

نہیں، ناٹ (Not)
نیور(Never)، نہ، نو (No)
اِن سبھی کی شروعات
اِک حرف
یعنی فقط ''ن'' سے ہوتی ہے
اور اِن سب کا مفہوم بھی ایک ہے
مجھ کو افسوس ہے
صرف اِس بات کا،
حرف پہلا ترے نام کا بھی
یہی ''ن'' ہے۔



کلر بلائنڈ

Colour Blind

پہچان نہیں ہے
رنگوں کی مجھ کو
میں اِس نعمت سے عاری ہوں
کیونکہ میں نے اب تک
اُس کے چہرے کی
قوسِ قزح کے رنگوں سے آگے
کوئی رنگ نہیں دیکھا



''جگاوا''

سبز چادر میں لپٹا ہوا
گورا چٹّا وجود
ایک دل میں دبی
کتنی معصوم سی خواہشوں کو
جگا دیتا ہے۔

☆

موڑ

دو مسافر جدا راہوں کے
اپنی منزل سے وہ بے خبر
اجنبی تھے مگر ساتھ چلتے رہے
دور کچھ ہی گئے تھے ابھی
موڑ اِک آ گیا
نام جس کا جدائی پڑا۔

☆

سوچ سفر

سفر
وہ بھی بس کا
کئی گھنٹوں لمبا
مسافر تھے خاموش بالکل
سبھی نیند میں گم تھے شاید
میں تنہا، اکیلا
کروں تو کروں کیا؟
کہ لمحہ صَدِی تھا
بتائے نہ بیتے
اچانک ہی پھر
دھیان کی سیڑھیوں سے
کسی کی سُجل یاد
اُتری تھی جو زینہ زینہ
سفر کٹ گیا میرا

☆

انجام

ایک لڑکا اور لڑکی
دونوں ہی اِک دوسرے کو
چاہتے تھے
پیار کی سچّائیوں سے
پوجتے تھے
روح کی گہرائیوں سے
مانگتے تھے رب سے
جیون میل سنگت کی دعائیں
جو کہ پوری ہو نہ پائیں
لڑکا جل کر مر گیا
اور
لڑکی زندہ رہ گئی
آنسو بہانے کو
کسی کا گھر بسانے کو
بچاری۔۔۔۔!

☆

کچی عمر کی چاہت

میری کچی عمر کی چاہت
تمہیں معلوم ہوگا
اِس کنواری عمر کی چاہت
کے سارے نقش
سارے رنگ
پکے، دیرپا
انمٹ، امر
ہوتے ہیں

میں تم کو بھلا دیتا
مگر یہ غیر ممکن ہے



دوسری ملاقات

آج سترہ (۱۷) دِنوں بعد
میں نے اُسے دیکھا تھا
وہ کسی زرد سوکھی ہوئی پتّیوں کی طرح
کرب چہرے پہ اوڑھے ہوئے
جب مرے پاس سے گذری وہ
اُس سے ملنے کی جتنی خوشی تھی مجھے
اُس کے چہرے کی پژمردگی دیکھ کر
سب اکارت گئی۔



گریہ کناں شبوں کا غم

سنو! تم کو پتہ ہوگا
کہ سردی کی شبیں تو لمبی ہوتی ہیں
پھر ایسے میں
کسی کی نیند اُڑ جائے
کسی کا چین کھو جائے
کسی کی کروٹوں سے
چادرِ بستر شکن آلود ہو جائے
کتابیں پڑھنے کو دل ہی نہ چاہے
فلم بھی دیکھی نہ جائے
سوچ پر اِک شخص چھایا ہو
وہ اپنا ہو، پرایا ہو
کہ جس نے دل دُکھایا ہو
تو ان لمحات میں
بس ''موت'' اچھی لگتی ہے۔



سلوشن

Solution

(نثری نظم)

ہاں یہ میری پہلی چاہت ہے
اور ابھی آغاز کی ساعت ہے
تیرے ساتھ گزرا وقت اچھا لگتا ہے
تیری آنکھیں شفّاف ہیں
تیرا لہجہ سچا لگتا ہے
تیری باتیں پیاری ہیں
تیرا چہرہ ''تھیسس'' (Thesis) ہے
میری آنکھیں قاری ہیں
جلدی جلدی ملتے ہیں

تیرے دل میں چند زیادہ
میرے دل میں کچھ کم
رنگ برنگے پھول مگر کھلتے ہیں
پھر کچھ لمحے گذریں گے
تجھ میں اِک تبدیلی آئے گی
تو عام سی لڑکی بن جائے گی
تنگ کرے گی
خوب ستائے گی
ملنے بھی کم کم آئے گی
کچھ نخرے دکھلائے گی
چاہت کا احساس دِلا کر
آنے کا احسان جِتا کر
تُو جانے کی بات کرے گی
میں آنکھوں آنکھوں میں روکوں گا
تُو سوری(Sorry) کہہ کر چل دے گی
ملنے کی اگلی تاریخ نہ اگلا دن
بتلائے بن۔۔۔۔
تُو چل دے گی
میں روکوں گا
ہلتے پردے کو تکتے تکتے
کچھ سوچوں گا
شاید یہ سوچوں گا
بدلی تُو ہی نہیں
میں بھی بدلا ہوں
یا صرف میں ہی بدلا ہوں
کیونکہ یہ میری پہلی چاہت تھی
پہلے پہلے راحت تھی
سُندر سپنے تھے
راتیں، دن اپنے تھے
لیکن اب راتیں صرف تری ہیں
دن بھی صرف ترے ہیں
ہیں تو بس سارے جرم مرے ہیں
جن کی یہ سزا ہے
یہ میری پہلی چاہت ہے
لیکن
شاید یہ تیرا پہلا پیار نہ ہو
شاید ایسا ہی ہو
میری اچھی دوست!
اس سے پہلے،
وقت ایسا آ جائے
میں تجھ سے
تُو مجھ سے کھو جائے
ہم دونوں کو
اپنے اپنے رستے بدلنے ہوں گے

☆

نومبر چل رہا

نومبر چل رہا ہے
خنکی پیہم بڑھ رہی ہے
ساتھ ہی اسکا رویہ سرد ہوتا جا رہا ہے اور
مجھ کو خدشہ ہے
ان برف جیسے موسموں کی ٹھنڈ میں
میری سسکتی چاہتوں کا
انت ہو جائے گا۔

☆

دسمبر جا رہا ہے

دسمبر جا رہا ہے
سبز شاخوں سے
شگوفے چھین کر
سوچوں پہ چھائی کہر سی ہے
بے ثباتی کا یہ عالم ہے
ہر اِک سہا ہوا ہے
ہر کوئی ڈرتا ہے
جانے کس گھڑی کیا حادثہ ہو جائے
سب پر خوف طاری ہے
گذرتے اِس برس نے
دُکھ دیے ہیں
چین چھینا ہے
ہمیں لیکن
ابھی جینا ہے
اِس اُمید پر
بدلیں گے یہ حالات
اگلے سال
ہوگی زندگی کی بات

☆

اندیشہ

ابھی دو (۲) دن گزرنے دو دسمبر کے
کہیں ایسا نہ ہو
پھر حادثہ اِک رونما ہو جائے
ہم تم ایک دوجے سے بچھڑ جائیں
دسمبر اب کے ہے سفّاک
اس میں کچھ بھی ہو سکتا ہے
مجھ کو لمحہ لمحہ ایک خدشہ ہے
ابھی گھر میں ہی تم بیٹھی رہو
بہتر ہے
مجھ سے مت ملو
بہتر ہے
کیلنڈر بدلنے دو ذرا دیوار سے
پھر چاہے آجانا۔۔۔۔۔



کیا کریں گے مل کے

روشنی نہیں دیتے
کچھ چراغ کِھل کے بھی
مانتا ہوں ہوتے ہیں
کچھ تقاضے دِل کے بھی
جب رہی نہیں چاہت
کیا کریں گے مِل کے بھی

☆

ای میل
E-mail

آج جب بکس(Box) کھولا
تو کافی دنوں بعد
ای میل تھی اُس کی
میسج تھا یہ اُس کا
''مجبور ہوں میں
مِری انگلیاں اب کبھی
کر سکیں گی نہ ٹائپ
ترا ایڈرِس(Adress)
مرتضٰی ایٹ داریٹ۔۔۔۔۔''

